حیرتوں کی نئی دنیا: رفیق حسین کے افسانے

New World of Wonders: Rafique Hussain's Short Stories

ڈاکٹر محمد نعیم

Abstract

The parallel world of words is called fiction. The imagination of writer uses her/his everyday experience and language to create this world. Rafique Hussain, an Urdu Short story writer, had spent decades in Terai's Jungles of northern India. He uses his wildlife experience to construct his fictional world. This makes his short stories a world of wonders. Although his concerns are very much humanistic like many of his contemporary Urdu writers, but the maximalist uses of flora and fauna to understand the diverse nature of the world around make him unique. This article analyses his style of writing and reconstruction of the world by focusing on his details.

Keywords: Rafique Hussain, Urdu Short Story, Reconstruction, Terai, Minimalism, Details in fiction

ایک دنیا ہمارے اردگرد پھیلی ہے، دوسری دنیا ہم اس کے ادراک سے بناتے ہیں اور تیسری دنیا بیان سے ایجاد کرتے ہیں۔ ہر بیان، کسی بیان کنندہ سے قائم ہوتا ہے اور دونوں کو زبان تعمیر کرتی ہے۔ زبان نئی دنیا پیدا کرنے کا امکان رکھتی ہے اسی لیے خالق 'کن' یعنی زبان کا ہی استعمال کرتا ہے اور پھر بنتے جانے کا سارا عمل 'فیکون' بھی زبان میں ہے۔ فکشن لسانی دنیا ایجاد کرنے کا فن ہے۔ ہر دنیا اپنے ضوابط رکھتی ہے۔ ادب میں اسے فارم کہا جاتا ہے۔ فکشن نگار زبان کو مسلسل دریافت کرتا اور اسے کسی فارم کے ذریعے متعینہ حدود میں صورت دیتا چلا جاتا ہے۔ کسی فکشن نگار کی دنیا ہمارے اردگرد پھیلی دنیا کے متوازی اپنا وجود قائم کرتی ہے۔ یہ لفظوں میں باندھا طلسم ہے جس کا تمام سحر دروبست کی نزاکتوں کا مرہون ہوتا ہے۔ فکشن نگار اپنے ادراک کی حدود اور افسانوی فارم کی توسیع بیک وقت کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ نہ کر سکے تو وہ مبلغ، مصلح، مولف، محتسب اور پیام بر تو ہو سکتا ہے فکشن نگار نہیں۔ اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جب بیان کی دنیا قائم ہو جائے تو وہ پیام بر سے آزاد کر دیتی ہے۔ اب مسافرِ قرأت اور میدانِ متن کے باہمی مکالمے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جس طرح نئی دنیا قاری کے لیے انوکھے تجربات کا سامان لیے ہوتی ہے اسی طرح نویکلا قاری بھی متن کے لیے نادر تجربہ ہوتا ہے۔

سید رفیق حسین کی افسانوی دنیا ایک فراواں تخیل، زندگی کے بھرپور تجربے اور غیر معمولی مشاہدے کے نتیجے میں زبان کے ان اجزا سے تعمیر ہوئی ہے جو آج اردو دان طبقے کے لیے مانوس نہیں ہیں۔اور شاید اسی لیے یہ کم شنیدہ ہے۔ یہاں ہماری ملاقات ایسی زندگی سے ہوتی ہے جو کسی اور اردو افسانہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی۔ایک ایسے شخص کے لیے اردو جس کی مادری زبان نہ ہو، بنڈیلا، گوند، مادینیں جیسے جانوروں کا ذکر بالکل نیا، انوکھا اور تعجب انگیز ہے۔اس پہ رفیق حسین کا بیانیہ ان جانوروں کی زندگی کے مختلف مراحل اور روزمرہ عادات کے بارے جزئیات سے پر ہے جو ترائی کے جنگلوں سے ان کی گہری واقفیت کی دلیل ہونے کے علاوہ اردو پہ ان کی غیر معمولی دسترس کا ثبوت بھی ہے۔ یہاں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ دو مختلف قاری اس متن سے کس طرح لطف اندوز ہوں گے جن میں کا ایک اس زبان اور ان ناموں سے واقف جب کہ دوسرے کے لیے یہ اجنبی ہوں۔متن اور قاری کے درمیان لسانی اشتراک اس لفظی ناواقفیت کو مانوس اجنبی بنا دیتا ہے۔دوسرے قاری کے لیے اجنبیت دلچسپی اور عجائبت سے پیدا ہونے والی کشش کا سامان بن جائے گی، یوں رفیق حسین کی افسانوی دنیا ترائی کے رہنے والے قاری اور اس ماحول سے ناواقف ہر دو کے لیے دو مختلف قسم کی لذتوں سے معمور ہے۔ظاہر ہے یہ لذتیں زبان سے زندہ تعلق نے فراہم کی ہیں۔رفیق حسین کا کمال یہ نہیں کہ وہ ترائی کے جنگلوں کے دور دراز گوشوں اور ان میں سانس لیتی حیوانی زندگی اور نباتاتی افزائش سے واقف تھے، یہ واقفیت تو اس منطقے کے ہر اس تعلقہ دار کا خاصہ رہی ہوگی جسے شکار کا ذوق تھا۔ان کا امتیاز اس زندگی کی ہمہ ہمی کو زبان کے اندر تشکیل دینے کے لیے ایسا اسلوب وضع کرنا ہے جو انھی سے خاص ہے۔ ایک آدھ مثال سن لیجیے کہ دھڑکتی نثر آپ کے کانوں سے دل تک کا راستہ پا سکے۔

> ''برف میں جھلا ہوا پانی شفاف پانی کہیں بوندوں بوندوں ٹپٹپاتا ہے، کہیں منّی منّی نالیوں میں شلشلاتا اور جھلملاتا ہے، کہیں پتھروں کو کتراتا ہوا چٹانوں سے سلوں پر اور سلوں پر سے چٹانوں پر کودتا ہوا پانی چشموں کی صورت میں گنگناتا، مسکراتا، ہنستا، ہنساتا ہوا بہتا ہے۔''(۱)

رفیق حسین نے گیارہ برس ترائی کے جنگلوں میں ملازمت کے سبب گزارے(۲) پہاڑی نالوں میں بہتے پانی کی صوتی صورت گری کرتا یہ ایک جملہ نہ صرف نمائندگی کی مثال ہے بلکہ پانی کی تجسیم سازی بھی کر رہا ہے۔ ہم میں سے بیشتر پہاڑی نالوں میں بہتے پانی سے مل چکے ہیں لیکن اس افسانوی دنیا میں پائے جانے والے مسکراتے مجسم پانی کے بعد ہماری ملاقاتوں کا رنگ بدل جائے گا۔کیسی دلچسپ بات ہے کہ تیسری دنیا کا لفظی پانی قاری کے لیے پہلی دنیا کے حقیقی پانی سے ملاقات اور ادراک کو بدل دے گا۔ثروت حسین نے یوں ہی تو نہیں کہا تھا:

گھر سے نکلا تو ملاقات ہوئی پانی سے
کہاں ملتی ہے خوشی اتنی فراوانی سے(۳)

اس ایک جملے میں پائے جانے والے افعال کی کثرت دیکھیے۔رومانوی ادیبوں نے جملے کو صفات کے

سہارے چلانے کی کوشش کی ،افعال غائب ہوتے چلے گئے ۔ایسے جملوں کو وارث علوی نے لجلجے کہا تھا۔(۴) ہم ایسے کم شناسوں سے بیسویں صدی گزرتے گزرتے صفات بھی لے گئی۔ ہر پھر کے دو چار حرفوں سے دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں دیکھیے پانی کی مختلف کیفیتوں کے لیے الگ الگ افعال ہیں۔ یوں پانی اپنے طور پہ ایک الگ طلسماتی دنیا بن جاتا ہے جو پتھروں کو کترتا ہے اور چشموں میں گنگناتا ہے۔

رفیق حسین کی نثر کی خاص بات جزئیات نگاری ہے۔ کسی عمل، کیفیت یا منظر کے ایک ایک جزو کا خیال رکھا گیا ہے۔ جملہ طویل لیکن چھوٹے چھوٹے اجزا میں تقسیم ہے، جسے صفات، افعال اور ضمائر کی کڑیوں سے دھاگہ دھاگہ بنا گیا ہے۔

ایک مثال دیکھیے:

بچے کو چھوڑ، جنگلے سے کود، دو گز پرے کھڑے ہو کر، کان پیچھے کو تان، ہونٹ سکیڑ، دہانے کو گول دائرہ بنا، خوخو کی بھبکی دی، مگر دو پیروں پہ کھڑے ہو کر دیکھا تو روٹی تھی۔(۵)

جب یہ طے ہو گیا کہ فکشن لفظوں سے بنائی گئی دنیا ہے تو لازم آیا کہ کہانی بننے کا کام ہو یا کردار کی تشکیل، زبان پہ گرفت کے بغیر یہ منازل سر نہیں ہوتیں۔ مصنف کا متخیلہ لفظوں کے کے ذریعے نیا امیج تشکیل دیتا ہے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو فکشن، جو ہے ہی بنانے کا عمل، وہ محض نقل بن کر رہ جائے گا۔ اور وہ فکشن ہی نہیں جس میں کچھ نیا نہ ہو۔ امیج کے بارے یاد رکھنا چاہیے کہ متحرک ہو تو پر اثر ہوتا ہے، ساکن منظر نگاری تو رنگروٹوں کا کھیل تماشا ہوتا ہے۔ اوپر ایک جملے میں ایک فعل کے آٹھ مختلف متحرک مراحل کو دکھایا گیا ہے۔ اور یہ ممکن ہوا ہے افعال کی کثرت سے۔

رفیق حسین کے افسانوں میں ہمارا سامنا ایسی بھرپور دنیا سے ہوتا ہے جو جمادات میں ڈھلے عناصر سے لے کر نباتات، حیوانات اور انسانوں پہ مشتمل ہے۔ یہ دنیا بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں لکھے جانے والے افسانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں معاصر افسانے کی طرح روحِ عصر تو موجود ہے لیکن سماجی مسائل کے آسمان کو انسان کی شہری دنیا کی کھڑکی سے دیکھنے کی بجائے فطرت کے مہیب وسعتوں میں پھیلے جنگلوں کے ذریعے خلق کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ جب بھی انسان فطرت کی نمائندگی زبان کے اندر کرے گا تو وہ پہلی دنیا کی بجائے دوسری یا تیسری دنیا میں جا نکلے گا۔ جسے ہم جنگل کا قانون کہتے ہیں وہ انسانی تشکیل ہے، اس کا جنگل سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا آج ہمارا فطرت سے ہے۔ یہ انسان کی معنی سازی ہے جو جنگل کی بے ترتیبی کو کسی ہیئت کے سانچے میں لا کر ادراک کا باغ بنا دیتی ہے۔ سو رفیق حسین کے افسانوں میں پایا جانے والا جنگل ان کی لسانی تشکیل ہے جسے وہ اپنے معاصر سماجی مسائل کی تفہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''آئینۂ حیرت'' میں مذکور بندریا کے بندر سے تعلق کو وہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جغادری صاحب ان سے بے حد خفا تھے۔ ان کی شکایتیں بھی بجا تھیں۔ بے وقت کا زچہ خانہ، پیچھے رہنا، دیر

میں آنا وغیرہ وغیرہ۔ خوخیاتے، بھبکیاتے پہنچے اور بری طرح بندریا کی خبر لی۔ انتہا یہ کہ دم پکڑ کر کھینچی (جو کہ انسانوں میں عورت کی چوٹی پکڑ کر کھینچنے کے برابر ہے۔) بندریا نے سب ہی طرح سے معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، اپنی مجبوریاں پیش کیں، اپنے عذر بیان کیے۔۔۔'' (۶)

بندر اور بندریا کی لڑائی جب مرد بیان کرتا ہے تو انھیں میاں بیوی کا جھگڑا بنا دیتا ہے۔ ٹی وی پہ پیش کی جانے والی حیوانی دنیا ہو یا تحریر میں نمائندگی پانے والی غیر انسانی دنیا، ہر دو انسانی ادراک کی تخلیق ہوتی ہیں۔ اور اسی لیے معنی سازی کا نقش ہیں۔

رفیق حسین کے ہاں انسان اپنے ارد گرد پھیلی کائنات سے الگ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی تعمیر میں چاروں اور پھیلی فطرت شامل ہے۔ جانوروں کے غول، شکار، جھیلوں کے کنارے موجود درختوں کے جھڑتے پتے اور مالا کی ہاتھی چھپواں گھاس، انسانی جبلتوں اور سماجی ناہمواریوں کی تفہیم کا سامان بن گئے ہیں۔ وہ جنگل میں موجود ہر فرعون کے لیے کوئی نہ کوئی موسیٰ دکھا دیتے ہیں۔

بات جنگلوں کی خاک چھاننے تک محدود نہیں، انسانی رشتے اور معاشی افتراق بھی بیانیے کی تعمیر میں شامل ہیں۔ بیوہ نند اور آسودہ بھاوج کے باہمی تعلق کی صورت گری بھی ان کے ہاں مل جاتی ہے۔ ان کے بیانیے کی خاص بات صفات کا استعمال ہے، جن کی مدد سے وہ کردار کا تعارف ایک سطر میں ہی پیش کر دیتے ہیں:

سفید رنگ، سادہ پوش، سفید بال، دبلی پتلی، بے وجہ ہنسنے والی، عقل سے خارج، ہر چیز پہ قانع، ہر چیز سے خوش، یہ فردوس بانو کی ماں یا قریشی صاحب کی ساس ہیں۔۔۔۔ دوسری موٹی، بھدی، زیورات سے آراستہ، رنگین کپڑوں کا پلندہ، کھچڑی سر، سرگیں آنکھیں بھنویں تنی، منھ ٹیڑھا، قریشی صاحب کی ماں اور اس لیے فردوس بانو کی ساس ہیں۔(۷)

یہ افسانوی دنیا محض اپنی عجائبت سے ہی مسحور نہیں کرتی، یہاں واقعات کے درمیان اسباب وعلل کی زنجیر کا خیال بھی رہتا ہے۔ مثلاً ''آئینۂ حیرت'' کے ابتدائی صفحات میں ایک پہاڑی مزدور ڈھٹیال کا ذکر ملتا، افسانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے، بیانیہ قریشی صاحب کے قصے پہ مرکوز ہو جاتا ہے۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے جیسے ہی قاری کے ذہن میں ڈھٹیال کے اس افسانے سے تعلق بارے سوال اٹھتے ہیں کہ کیا اسے محض امیر غریب کے فرق کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا گیا یا قریشی صاحب کی انسان دوستی کو سامنے لانا مقصود تھا؟ اگر بات یہیں تک رہتی تو ڈھٹیال کی موجودگی فنی سقم ہو سکتی تھی اور افسانہ اس تبلیغی رجحان کا نمائندہ بن جاتا جس کا ہو کا اردو کے کئی جلد باز اور بزعم خود سماج سدھار افسانہ نگاروں کو ہوتا ہے۔ رفیق حسین افسانے کے اختتام پہ لینڈ سلائیڈنگ کے نتیجے میں قریشی صاحب کے تباہ ہو جانے والے محل سے ایک بندریا کے ذریعے بچ جانے والے بچے کو اس ڈھٹیال کے سپرد کرتے ہیں۔ یوں قریشی کی طرف سے ڈھٹیال کی مدد کا سلسلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

رفیق حسین کے فراواں تخیل کا اظہار ''فسانۂ اکبر'' اور ''حضت وہ تو نکل گئے'' میں ملتا ہے۔ یہ افسانے اس

حوالے خاص ہیں کہ یہاں بنائی گئی روزمرہ دنیا اور متخیلہ کے سہارے بنی ناشناسا فضا، دونوں کے درمیان فرق مٹا دیا گیا ہے۔ یہیں کہیں طلسماتی حقیقت سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ جو حقیقی ہے اور ایسے تمام واقعات جنھیں قاری پڑھ کر دبدھے میں پڑھ جائے کم از کم افسانوی دنیا کے کرداروں کے لیے وہ واقعی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر یقین آجائے گا کہ عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے۔''حضت وہ تو نکل گئے''، لکھنؤ کی گزشتہ شان کو ناسٹلجیائی انداز میں بیان تو کرتا ہے تاہم اتنا نہیں کہ پورا افسانہ نوحہ بن جائے۔ دوسری سطح پر یہ افسانہ اس 'شان' کے حوالے سے شکوک بھی ابھار دیتا ہے۔ یہاں سنکی استاد ہے اور قسم قسم کے نشے ہیں۔ غیر معمولی واقعات کو پینک کے ساتھ جوڑ کر قاری کے لیے مرئی حقیقت اور شاعرانہ منطق کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک کردار نبن میاں کا ہے جو پرانے لکھنؤ کی شان کو روتے ہیں اور اب ایک یکہ بردار ہیں۔ افسانے کے راوی کو یہی یکہ لکھنؤ کی سیر کے لیے پسند آتا ہے مگر اس کے دوست مسعود میاں محترز ہیں۔ نبن میاں اپنے استاد کا قصہ سناتے ہیں جو اڑنا سیکھتے سیکھتے خود کو اتنا بے وزن کر لیتے ہیں کہ انھیں زمین سے باندھے رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ابتدأ مسعود کا نبن اور اس کی کہانی پر اعتبار جمتا نہیں، مگر جیسے جیسے کہانی انجام کو پہنچتی ہے مسعود کے ساتھ ساتھ قاری بھی اس کے غیر معمولی انجام پر یقین کرنے لگتا ہے کہ استاد کو جس رسی سے نبن نے باندھا تھا وہ غنودگی میں چھوٹ گئی اور رات کے سبب وہ نہ دیکھ سکے کہ جس اجنبی کمرے نما کھنڈر میں وہ موجود ہیں، اس کی چھت نہیں ہے، روشنی کرنے پہ جب معلوم ہوتا ہے تو افسانے کا عنوان بنا جملہ سامنے آتا ہے:''اے حضت وہ تو نکل گئے۔'' اس مقام پہ مسعود کا جملہ جو افسانے کا آخری فقرہ ہے، رفیق حسین کے جادو کا اظہار ہے۔ مسعود کہانی کے راوی کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے: کیوں جی! استاد فدن صاحب اب بھی چلے جا رہے ہوں گے؟ نہ معلوم کہاں تک چلے گئے ہوں گے۔ نہ معلوم کب تک چلے جائیں گے۔''(۸)۔ یہاں دلچسپ بات یہ کہ اعتبار قائم ہو جاتا ہے اس لیے یہاں 'کچھ' ہے اور یہ کائنات مکمل بھی ہے۔ 'فسانہ اکبر' کو حقیقی دکھانے کے لیے آپ بیتی کا رنگ دیا گیا ہے۔ باقاعدہ تاریخوں اور مقامات کا استعمال اور متکلم راوی، قاری کے لیے حیرت افزا واقعات کی تسلیم تک لے جاتا ہے۔

رفیق حسین ہماری افسانوی روایت میں کثیر لفظیات، متنوع فضا، بھرپور کردار، سماجی نمائندگی، انفرادی احساس کی پیش کش اور جنگل کی بھری پری نمو پذیر حیات کی نمائندگی کے حوالے منفرد آواز ہے۔ اس انفراد کے قیام کی ایک ممکنہ وجہ اپنے معاصر اردو افسانوں سے ان کی برگشتگی بھی ہے۔''خودنوشت'' کے عنوان سے اپنے بارے لکھے دو صفحات میں انھوں نے قریب دو ہزار انگریزی کتب کے مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اردو کی طرف ان کی طبیعت نہ آتی تھی جسے ان کی بہن اور بیٹی نے غلامانہ ذہنیت قرار دیا اور طعنہ دیا کہ خود لکھ کر اردو کی کم مائیگی دور کریں، جس کے نتیجے میں یہ افسانے تخلیق ہوئے۔ ایک خاص بات وہ اردو فکشن میں عشق و عاشقی کی بے پناہ موجودگی کو ناپسند کرتے تھے۔(۹) ان متنوع اسباب نے مل کر وہ دنیا تشکیل دی جو حیرتوں سے پُر ہے۔

حواشی:

۱۔ سید رفیق حسین، آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں (دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۴ء)، ص ۷۳۔
۲۔ سید رفیق حسین، ''خود نوشت،'' مشمولہ آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۲۴۔
۳۔ ثروت حسین، کلیاتِ ثروت حسین (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۳۵۔
۴۔ وارث علوی، جدید افسانۂ اور اس کے مسائل (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲ء)۔
۵۔ سید رفیق حسین، آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں، ۸۹۔
۶۔ ایضاً، ص ۸۸۔
۷۔ ایضاً، ص ۹۷۔
۸۔ سید رفیق حسین، ''رخصت وہ تو نکل گئے،'' مشمولہ آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں، ص ۱۹۸۔
۹۔ سید رفیق حسین، ''خود نوشت،'' ص ۴-۳۲۳۔

ماخذ

ثروت حسین۔ کلیاتِ ثروت حسین ۔کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۱۷ء۔
سید رفیق حسین۔ آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں۔دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۴ء۔
سید رفیق حسین۔ آئینۂ حیرت اور دوسری کہانیاں۔کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲ء۔
وارث علوی۔ جدید افسانۂ اور اس کے مسائل۔کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲ء۔